اعجاز شفیع گیلانی

نوٹ : قبولیت اور مقبولیت والے پہلو کو دیکھ لینا ضروری ہے۔ایک جگہ پر آ رہا کہ مقبولیت سے زیادہ قبولیت ضروری ہے۔اور پھر آ رہا کہ قبولیت ضروری نہیں کہ ووٹ بینک میں تبدیل ہو۔ وغیرہ۔ مقبولیت ووٹ بینک میں تبدیل نہیں ہوتی یا قبولیت ؟

پاکستان میں بحرانوں اور بالخصوص موجودہ بحران کا سلسلہ کیا ہے ؟

ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ موجودہ بحران جس میں کوئی وقفہ نہیں آ رہا، تقریباً دوہزار نو، دس سے شروع ہوا تھا۔

دوہزار آٹھ میں ایک حکومت بنی تھی جو اپنے سے پہلے کے زمانے کی تسلسل کی حکومتوں سے مختلف فرق کے راستے پر تھی۔اُس حکومت میں کچھ پرانی سیاسی قوتوں کا تسلسل تھا لیکن ایک فرق کے ساتھ ،کچھ نئی سیاسی قوتیں بھی شامل تھیں اور سیاسی وانتظامی طاقتوں کے توازن میں بھی تبدیلی آ رہی تھی۔اُسی کے اندر سے دستوری ترامیم بھی ابھر رہی تھیں۔کچھ دستوری ترامیم پیشتر ایک خاص راستے پر ڈال چکی تھیں اور کچھ ملک کے سیاسی ڈھانچے میں بھی تبدیلی لا رہی تھیں۔ تو اس بحران کا آغاز اس سے ہوا کہ (اُنیس سو ستر سے جو دو برابر کی جنھیں کولیشن کہہ سکتے ہیں، کولیشن ان معنوں میں کہ چاہے وہ ایک نام بن جائے لیکن ان کے نیچے کوئی ایک بڑی ووٹ لینے والی طاقت اور کچھ چھوٹی ووٹ لینے والی طاقتیں آپس میں ایک پلیٹ فارم پر جمع ہو جاتی ہیں، تو انیس

سو ستر سے یہ ایک دو طرفہ ،اسے سیاسیات کی زبان میں plurality (کثرتِ رائے) کہتے ہیں۔

ان میں سے کوئی بھی پچاس فیصد سے اُوپر نہیں جارہا ہوتا۔ لیکن وہ چالیس فیصد کے قریب pluralities

(نسبتی اکثریت) ہوتی ہیں۔ میجورٹی ان معنوں میں کہ پچاس سے زیادہ ہے ،ایک بھی نہیں ہوتی۔ لیکن یہ کسی بھی بڑے سیاسی گروہ یا سیاسی جماعت کو اس وقت نصیب ہوتا ہے اور جب وہ کچھ اور اپنے سے ملتے جلتے نظریات کی

پارٹیوں کو اپنے سائے میں لے لے ،اس کے ووٹرز کو اپنے سائے میں لے لیں یا اس کی پارٹی کو بھی اپنے سائے میں لے لیں۔ یہ دو ہزار دس کے لگ بھگ سے ٹیم کی شکل اختیار کرنے لگ گئیں)

انیس سو ستر سے سیاسی میدان کا ایک توازن تھا،اُس کی وجہ سے سیاسی اور انتظامی اداروں میں بھی توازن تھا وہ پھر بگڑ گیا،یوں وہ توازن تاحال نہیں سلجھ پایا ہے۔یہی وجہ ہے کہ بحران مسلسل جاری ہے۔

ملک کے انتظامی ڈھانچے میں بحران ہو، سیاسی یا سماجی ڈھانچے ، کہ سماج کا بھی اپناڈھانچا ہوتا ہے یا پھر سماج کے مختلف ڈھانچوں میں ہو، ہم یہاں موجودہ بحران کو کچھ اعداد و شمار کی زبان میں بیان کریں گے تاکہ ٹھوس اقدامات کے لیے رہنمائی ہو سکے۔ ہم پہلے بات کرتے ہیں،اُن اعداد و شمار کی جسے اس کی ضرورت سمجھ لینا چاہیے۔تو پہلے یہ جاننا ضروری ہے کہ اس طرح کے معاملات میں افراد اور سیاسی جماعتوں کی کوئی حیثیت ہوتی ہے ؟اور انتظامی بشمول سیاسی و غیر سیاسی انتظامی اداروں کی کوئی حیثیت ہوتی ہے ؟یعنی افراد، سیاسی جماعتوں اور اداروں کی حیثیت۔

اس وقت ویسے تو آٹھ دس افراد ہیں جو ملک کے سیاسی وزن کی نمائندگی کرتے ہیں۔لیکن تین افراد سب سے زیادہ نمایاں ہیں۔ایک عمران خان، دوسرے نواز شریف اور تیسرے اب بلاول بھٹو زرداری، یہ اگرچہ صدر زرداری کی بھی نمائندگی کرتے ہیں۔ان تینوں کی عوام میں کیا حیثیت ہے اور اُس حیثیت میں پچھے دس اور خصوصاً پانچ سال میں کوئی تبدیلی آئی ہے ؟ یا نہیں آئی۔؟

ہم دس سال کے بجائے، پچھلے پانچ سال کی بات کرتے ہیں، کیونکہ گذشتہ دس سال کی سیاست پر میری بہت سی تحریریں موجود ہیں۔ پچھلے پانچ سال میں عمران خان کی عوام میں مقبولیت اور پھر قبولیت کا پیمانہ کیا رہا۔؟ یہ چیز کہ قبولیت کتنی ہے ،زیادہ اہمیت کی حامل ہے اور یہ بھی ضروری نہیں ہے مقبولیت سیاسی ووٹ بینک میں تبدیل ہو ۔لیکن دیکھنا یہ چاہیے کہ قبولیت کتنی ہے۔؟

عمران خان کی قبولیت کوئی پچاس سے ساٹھ، نواز شریف کی پینتیس سے چالیس فیصد تک ہے۔نواز شریف کی قبولیت ساٹھ، پینسٹھ سے گری ہے۔ عمران خان کی بھی ساٹھ، پینسٹھ سے گری ہے۔ لیکن نواز شریف کی زیادہ اور

عمران خان کی کم گری ہے۔ بلاول بھٹو کی پینتیس سے چالیس پر ہے۔ بلاول بھٹو کی اس حیثیت پر آنے سے پہلے زرداری صاحب کی یہ بیس سے پچیس پر بہ مشکل تھی۔لہٰذا کچھ بڑھی ہے۔افراد کی یہ قبولیت ووٹوں میں تبدیل نہیں ہوتی، بعض مرتبہ تو بہت بڑا فرق ہوتا ہے۔جب عمران خان کی یہ حیثیت ساٹھ سے پینسٹھ پر تھی تو ووٹ ایک فیصد بھی نہیں تھا۔ پھر ایک سطح پر یہ ووٹ پندرہ فیصد تک ہو گیا۔ پھر اس سطح پر جا کر اس میں سے جو ووٹ نکلا تو وہ تیس سے پینتیس فیصد تک پہنچا۔ نواز شریف کی قبولیت جب ساٹھ سے پینسٹھ پر تھی تو اس کا ووٹ چالیس سے پینتالیس پر بھی تھا۔ کیونکہ وہ کولیشن کی سیاست سے اُبھرا تھا۔ مسلم لیگ نے مختلف سماجی طبقوں کو جمع کیا، کچھ ایسے سماجی طبقے جو سماجی اقدار، سیاسی اسباب معاشی نظام کے بدل جانے کی وجہ سے کہنہ نظام میں بھی تھے اور ذرا ڈگمگا کر ایک سطح پر نئے میں بھی چلے گئے تھے۔ وہ سب اس کے بنیادی بلکہ اضافی گروہ تھے۔ مختلف نوعیت کے گروہوں کو جمع کرنے کی وجہ سے مسلم لیگ، مسلم لیگ تھی۔

ہم بلاول بھٹو کی قبولیت جسے تیس سے پینتیس کہہ رہے ہیں، بے نظیر بھٹو کے کیس میں پچاس سے ساٹھ یا پینتالیس سے پچاس فیصد پر بھی تھی۔ چونکہ متنازعہ دونوں سائیڈوں پر بڑی بڑی طاقتیں تھیں۔ ووٹ ایک سطح پر چالیس سے پچاس فیصد قبولیت کا تھا۔ اس لیے قبولیت اور ووٹ میں کوئی براہِ راست تعلق نہیں ہوتا۔ تاہم مختلف موقع پر ہو بھی جاتا ہے۔ سیاسی جماعت کے لحاظ سے تھوڑے بہت فرق کے ساتھ پچھلے عرصہ سے اتار چڑھاؤ ہوتا رہا۔ لیکن 2024 میں یہ واپس آ گیا۔ (نوٹ: کس سطح پر واپس آ گیا۔۔ پرانی یا؟) یہ جو ہم اعتراضات کر رہے ہیں اُنھیں گنجائش دے رہے ہیں، جس گنجائش کے اعتراضات مستحق ہیں۔ میری افراد اور سیاسی جماعتوں کے حوالے سے باتیں کوئی مجرد نہیں ہیں، اس میں اعداد و شمار شامل ہیں۔ یہاں اب ہم اپنی تیسری بات کی طرف آتے ہیں۔ یعنی اداروں کی بات کی طرف۔ سیاست دان، چاہے وہ گلی محلے کا ہو یا مرکزی سطح کا، وہ بھی پاکستان کی حد تک ایک اداراتی سی شکل رکھتا ہے۔ اس لیے وہ مارشل لاؤں میں بھی زندہ رہتا ہے اور سیاسی جماعتوں کے زمانے میں بھی اپنے طور پر ایک حیثیت رکھتا ہے۔ سیاست دان کسی بھی سطح اور جماعت کا ہو، وہ ادارے کی حیثیت سے اپنی ایک شناخت رکھتا ہے۔

اگر پولیس کے ادارے کی بات کریں تو پولیس ایک دبدبے اور قتذار کا نام ہے۔اقتذار سیاست دان کو ایک اور نام دیتا ہے۔ پولیس کا اقتدار دبدبے کا ہوتا ہے۔ ملک کا عدالتی نظام بھی اقتدار اور دبدبے کی نمائندگی کرتا ہے۔ لیکن یہ ہتھیار اور ڈنڈے کا دبدبہ نہیں بلکہ اس کی بات کو نہ تو سیاسی طبقے کو رد کرنے کی حیثیت ہوتی ہے اور نہ مقتدر ڈنڈے والے دبدبے کی حیثیت ہوتی ہے اور نہ عوام کی۔اس میں ایک نازک سا توازن ہے، کیونکہ اس دبدبے کے نیچے یہی طاقت ہے۔ یعنی ہر طبقے میں اس کی قبولیت اور ہر طبقے میں اس کی سطح، جو کبھی اوپر اور کبھی نیچے جاتی ہے ۔ جیسے سیاست دان طبقے کی اوپر نیچے جاتی ہے۔ جیسے پولیس کی اوپر نیچے جاتی ہے۔اسی طرح سے جیسے ابلاغ ہے ،ابلاغ کی ایک مجموعی طور پر سمت، جسے ہم میڈیا، سائبر سپیس بھی کہہ دیتے ہیں،اس کی بھی ایک ادارے کے طور پر حیثیت ہے۔اس سے قطع نظر کہ اس کا میڈیم اور برانڈ کون سا ہے۔ ؟اس کا متن کیا ہے۔ ؟

پاکستان میں شاید، جدید پاکستان میں انیس سو باہتر کے بعد سب سے مضبوط ادارے کے طور پر افواج پاکستان کا ادارہ ابھرا۔افواج پاکستان کی ادارے کی حیثیت سے قبولیت ہوتی ہے۔اس قبولیت میں اتار چڑھاؤ آتا رہتا ہے۔ انیس سو باہتر کے بعد اس کی قبولیت میں بالعموم سب سے زیادہ، جو حیثیت ہم نے پہلے سے گنوائی ہے،اُن میں سب سے اوپر اس ادارے کی ہوتی ہے۔ جس کا آگے بھی ذکر آئے گا۔وہ جسے معزز یا مقدس سمجھتے ہیں، معزز احساسات یا مقدس احساسات، جو مدرسے، مسجد یا مزار میں یا پھر اسی نوعیت کے غیر مذہبی سی اقدار ہو جو کسی تقدیس سے حاصل کی ہو تو اس تقدس کا بھی کم و بیش جیسے میڈیا ہے یہ مادی چیز نہیں ہے، چھوئی نہیں جاسکتی، لیکن اس تقدس کی بھی ایک ادارتی سی حیثیت بن جاتی ہے۔اور اس کا بھی اتار چڑھاؤ ہے۔ ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ گذشتہ پانچ سال میں ان اداروں کی قبولیت کا اتار چڑھاؤ کیا ہے ؟اس کے اسباب کیا ہیں۔ ؟اور اس وقت کی کیفیت کیا ہے۔ ؟اس وقت کی کیفیت میں افواج پاکستان ہی سب سے اوپر ہے۔ ماضی سے کچھ کمی ہے، لیکن بہت زیادہ کمی نہیں۔ یہ بات اسی طرح سمجھ میں آتی ہے کہ ملک کے اندر جسے ہم کہتے ہیں کہ یہ آرڈر کی اور نظم وضبط کی،انیس سو باہتر کے بعد بڑے انقلاب آئے ہیں۔انیس سو ستتر کے بعد خاص طور پر باہتر سے ستتر تک ہم پرانے ماضی سے نئے مستقبل کی طرف بڑھ رہے تھے، لیکن انیس سو ستتر کے بعد بیشتر کلیدی نوعیت کے معاملات کا سڑک اور بازار میں جھگڑے اور فساد سے حل نہیں نکلا، بالعموم آخر میں کسی بھی فساد کے امکان کو فوج نے باہمی اتفاق سے اس کے اندر سے

کوئی حل نکالا ہے۔ یہ انیس سو ستر، ستتر، پچاسی، اٹھاسی، نوے، ترانوے، ستانوے اور ننانوے میں بھی ہوا، ننانوے سے لے کر دو ہزار آٹھ میں بھی ہوا۔اور دو ہزار آٹھ کے بعد مختلف کیفیات پیدا ہوئی ہیں، لیکن سڑکوں کے ہنگامے سے کوئی نئی صورت حال کبھی پیدا نہیں ہوئی۔ پرویز مشرف کی ایک سطح پر اکثریتی حمایت تھی۔اس لیے ننانوے میں سیاسی حکومتوں کے رخصت ہونے کو قبولیت حاصل ہوئی۔ پھر دو ہزار آٹھ میں بہت مخالفت تھی، اس میں دو تہائی اکثریت بھی مخالفت کر رہی تھی، لیکن یہ فیصلہ سڑک پر نہیں ہوا تھا۔ یہ فیصلہ فوج کے خود اپنی ہی سر براہی میں ہوا تھا۔اس کے بعد سے بھی یہی کیفیت ہے کہ اس قبولیت میں افراد کے طور پر بھی اور ایک تنظیمی ادارے کے طور پر بھی اتار چڑھاؤ ہوتا ہے لیکن ہمیں اعداد و شمار میں کبھی یہ دوسرے نمبر پر نہیں نظر آیا۔ ہم پینتالیس سال سے یہ اعداد و شمار جمع کر رہے ہیں، اس میں ہم نے دیگر دنیا میں بھی معمولی استثنا کے علاوہ، چونکہ عام سیاسی نظام میں عوام کے ذہن میں ایک نظم و ضبط کی اہمیت ہوتی ہے، اس وقت بھی یہ کیفیت ہے کہ مختلف طبقات میں مختلف شرحوں میں مختلف ایشوز پر، یہ سب ادارے جن کا ذکر آیا، یہ متنازعہ بھی ہیں اور قابلِ قبول بھی ہیں۔ یہ کیفیت ویسے طبقات میں ایشوز کے علاوہ ملک کے مختلف علاقوں کے بارے میں بھی ہے۔اس پینتالیس سال میں ہمیں ان اداروں کے بارے میں علاقائی فرق بھی بعض اوقات بہت بڑھا ہوا ملا ہے۔ بعض اوقات علاقائی فرق بالکل سمٹ جاتا ہے۔اس لیے اُس پر جب میرے جیسا بزرگ کوئی بات کرتا ہے، جس کو پینتالیس پچاس سال سے کچھ نبض پر ہاتھ رکھنے کے علمی مواقع حاصل ہوتے رہے ہیں تو اس کے ذہن میں یہ تمام باتیں ہوتی ہیں اور وہ اگر ایک پانچ سال کو، پچاس سال سے تقابل کرتا ہے تو کرتے کرتے، نباض بھی جب نبض پر ہاتھ رکھتے ہیں، چاہے وہ جدید ڈاکٹر ہوں یا قدیم ڈاکٹر تو وہ کچھ نہ کچھ مرض کے بارے ضرور جان لیتے ہیں۔ تو اس وقت بھی ملک میں بد نظمی کی خواہش نہیں ہے۔ انیس سو نوے کے لگ بھگ سے عوام میں سیاسی اختلافات سے انتشار پیدا کرنے کی قبولیت نہیں ہے۔ چنانچہ عوام کے اس دباو کی وجہ سے ایسے سیاسی گروہ جن کی پہچان ہی انتشار ہو، ان کو بھی اتفاق کے راستے پر لگا دیا۔ چنانچہ انیس سو ستر اور ستتر کے دو بہت ہی انتشاری گروہ جن میں محبت اور نفرت کا رشتہ تھا دو ہزار آٹھ تک پہنچتے پہنچتے ان میں انتشار کی بجائے اتفاق رائے بنیاد بن گیا۔اس پر مزید ایک پہلو بھی ہے کہ سیاست کے لیے ہم نے

جو انتظامی قوائد بنائے ہیں، یعنی ہم نے جس الیکٹورل سسٹم کو اختیار کیا ہے، ہمارے ہاں اس کی کوئی لمبی تاریخ نہیں ہے۔ کچھ ممالک میں اس کی سو ڈیڑھ سو سال کی تاریخ ہے۔

قانون کی تہہ میں کچھ مقاصد اور ذرائع بھی ہوتے ہیں کہ وہ سیاسی طاقتوں کو اس پر مجبور کرتا ہے کہ کوئی بھی سیاسی طاقت محض ایک خیال کی نہ رہے بلکہ وہ مختلف الخیال گروہوں کی ایک چھتری بن جائے۔ لیکن ایسی چھتری بھی نہیں جو کُل پر آ جائے۔ چنانچہ وہ نظام ایسا ہے جو دو چھتریاں بناتا ہے۔ دونوں میں سے کوئی بھی اکثریت بمعنی پچاس فیصد سے زائد ووٹ نہیں لیتا۔ اس لیے انگریزی زبان میں اس کو پلیر یلیٹی کہتے ہیں۔ یہ پچاس سے نیچے ہوتی ہے لیکن بڑی ہوتی ہے۔ ان دونوں میں سے یعنی پلیر یلیٹی اور میجوریٹی میں کوئی تھوڑا سا بڑا ہوتا ہے، اور جو تھوڑا سا بڑا ہوتا ہے، اس کو زیادہ حصہ مل جاتا ہے۔ ووٹ کو سیٹوں میں تبدیل کرنے کا بھی ایک فارمولا ہے۔ ایسا نہیں کہ وہ اس نظام میں ہے۔ اس لیے عام طور پر کوئی چالیس فیصد ووٹ لے تو اس کو ساٹھ سے ستر فیصد سیٹیں مل جاتی ہیں۔ حالانکہ دوسرے سے وہ پانچ سات فیصد ہی زیادہ ہوتا ہے، تو دو چھتریوں کا ایک نظام ہے۔ تو وہ دو چھتریاں ایک دوسرے سے بہت فاصلے پر ہیں، اپنے حجم کے لحاظ سے۔ دو ہزار دس سے ایک انتھک بحران کا آغاز ہوتا ہے، ایک سیاسی کیفیت ایسی ابھری ہے جو دو چھتریوں میں آ نہیں رہی، چونکہ جو دو سے تین کی کیفیت ہوئی ہے، اس تین میں نئی چھتری ایسی ہے کہ جس کا چھتری بننے سے مسلسل انکار ہے، اور وہ اپنی چھتری کے نیچے اپنے علاوہ کسی کو جگہ نہیں دے رہی اور وہ دو چھتریوں کو ملا کر ایک بڑی چھتری بھی نہیں بنا رہی۔ یہی وجہ ہے کہ جب وہ دو چھتریاں ہوتی ہیں تو دو سیاسی چھتریوں کے ساتھ انتظامی چھتریوں کا ایک چھاتا بننے کی بڑی ضرورت ہوتی ہے اور وہ چھاتا بھی کسی ایک کو چھتری دے کر نہیں چل سکتا۔ اس چھاتے کے نیچے بھی ایک سے زائد چھتریاں ہوں تو وہ چھاتا چلتا ہے۔ اسی چھاتے کو ملک میں استحکام کہتے ہیں۔ اسی چھاتے کو ہم کہتے ہیں کہ یہاں مختلف طرح کے علاقے، نظریات، ترجیحات، یہ امن وامان کے ساتھ آگے چل سکتے ہیں۔ دس سال سے ہم اس کیفیت کو پہنچ نہیں پا رہے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ پہلے جو اس طرح کی چھتری ہے وہ اگر بیس فیصد پر ہو تو پچیس فیصد، تیس فیصد پر ہو تو چالیس فیصد پر چلی جاتی ہے، کبھی چالیس سے پچاس فیصد پر جائے تو واپس بھی آ جاتی ہے، لیکن پھر بھی وہ چھتری رہتی ہے۔

لیکن جو پی ٹی آئی کی چھتری ہے، یہ جب ایک سے پندرہ پر اور پھر پندرہ سے بیس پر پہنچی تو تیس سے آگے نہیں بڑھی، اگر اس میں کوئی پانچ فیصد کا اضافہ بھی ہے تو وہ متنازعہ ہے۔ یہ اس سے آگے نہیں بڑھ پا رہی۔ یہی وجہ ہے کہ اس چھتری اور چھاتے کا تعلق بھی منہدم ہو گیا ہے۔ اس موجودہ بحران میں اور اس کے پیچھے اقتصادی اور سیاسی قوتوں کا بحران بھی شروع ہو گیا ہے۔ پھر کچھ تعلق عالم گیر معاملات اور قوتوں سے بھی ہوتا ہے اور ایسا عالمگیر سماجی و اقتصادی نمو سے بھی ہو رہا ہوتا ہے۔ افراد، سیاسی جماعتیں، ادارے اور اعداد و شمار میں اب کافی اتار چڑھاؤ آ گئے ہیں۔ دس سے ہم تیرہ، وہاں سے اٹھارہ اور اٹھارہ سے ہم بائیس میں پہنچے، بائیس سے آج ہم پچیس میں داخل ہو رہے ہیں۔ اب ہم ماضی میں نہیں جا سکتے۔ مَیں نے یہاں پہلے ادوار بھی رکھے ہیں، میری بلوغت میں ستر سے تمام شامل ہیں۔ اب ہم دو ہزار دس میں واپس نہیں جا سکتے۔ اس میں اندرون ملک حالات کا، سماج اور عالمی چیزوں، تمام کا دخل ہے۔ اس لیے اب ہمیں یہ جو کھیل کا میدان ہے، جس کے اوپر یہ چھتریاں اور چھاتے ہیں، اس میدان میں کچھ نیا پن لانے کی ضرورت ہے۔ بعض اوقات جب لوگ اس طرح کی گفتگو کرتے ہیں تو مجھے ذاتی طور پر اتنا پسند نہیں آتا لیکن اس کے لیے لفظ شطرنج کے تختے کا استعمال کرتے ہیں، مجھے اپنی افتادِ طبع کی وجہ سے چھتری یا چھاتا زیادہ بہتر لگتے ہیں۔ اگر مَیں شطرنج کے تختے کو چھتریاں اور چھاتا کہوں تو ہمیں تین نئی نوعیت کی چھتریوں کی ضرورت ہے۔ ایک سیاست کی چھتری۔ ایک انتظام کی چھتری۔ چونکہ سیاست کی چھتری کے پاس ہتھیار اور اس نوعیت کا دبدبہ نہیں ہوتا جو فوج اور پولیس کے پاس ہوتا ہے۔ اس کے پاس خزانے کی کنجی بھی اُس طرز کی نہیں ہوتی کہ جس طرز سے اُس کے اوپر جو افسر ہے، اُس کے پاس ہوتی ہے۔ اس کے پاس اُس طرز کا تقدس بھی نہیں ہوتا کہ جیسا تقدس سماجی اداروں کے پاس ہوتا ہے۔ اس کے پاس تو لین دین کا ایک ہتھیار ہوتا ہے، اس کے پاس جس کو بعض لوگ منفی معنوں میں لفظ استعمال کرتے ہیں مک مکا کا، یہ وہی کرتے ہیں جو درحقیقت لین دین کے اندر انصاف اور تقدس کو ناممکن سمجھتے ہیں۔ یہ مایوس لوگ ہیں۔ اس کا مطلب ہے وسط۔ قرآن پاک میں دانش مند کے لیے وسط کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ لین دین سے ہی وسط پہ پہنچتا ہے۔ اس وجہ سے سب سے زیادہ حکیم اس طبقہ کو کہتے ہیں جو طاقت اور مال کے بل بوتے پر نہیں بلکہ حکمت کے بل بوتے پر سب کا سربراہ سمجھا جاتا ہے۔ جس کو آپ چھتری یا شطرنج کا تختہ کہتے ہیں، اس شطرنج کے تختے میں جس کو ہم

سیاسی قواعد کہتے ہیں اُن میں تبدیلی کی ضرورت ہے۔اس طرح سے جو انتظام کی چھتری کا شطرنج کا تختہ ہے،اس کا اِس سے کیا تعلق ہو؟اس کو ہم نے از سر نو منظّم کرنا ہے۔یہ دونوں ہمیشہ قلیل تعداد میں ہو گی،کیونکہ یہ تو انتظامی ہیں،چاہے وہ سیاست کے ذریعے سے انتظام ہے چاہے وہ مقتدر ہونے کے لحاظ سے،قوت کے اسباب سے ہے،ہمیشہ تو انبوہِ کثیر وہ ہو گا جو سماج کہلائے گا۔اس کے بھی کچھ گروہ ہوں گے۔اُن گروہوں کی کچھ روایات ہوں گی،اس میں کہیں کہیں انتظامی کیفیات بھی ہوں گی،اُس کو اگر ہم تیسری چھتری کہیں یا تیسرا ایک شطرنج کا تختہ کہیں،اس کو بھی از سر نو منظّم کرنے کی ضرورت ہے۔اس میں کسی نہ کسی کو،چاہے وہ کوئی بزرگ ہو،کوئی مقتدر ہو،کوئی حکیم ہو،بالعموم دیگر قوتیں اُس کا انتظار کرتی رہتی ہیں،کہ اُس کی بات بارش کا پہلا قطرہ بنے۔اور اُس کی بات کا ایک اور ٹیسٹ بھی ہوتا ہے۔اُس کا ایک امتحان ہوتا ہے،اگر وہ قطرہ بارش میں تبدیل ہونے کی صلاحیت رکھتا ہے یا نہیں؟اس لیے اُس حکیم کو،اُس مقتدر کو،اُسی وقت تائید ہوتی ہے کہ جب فضا نم ہو ورنہ وہ قطرہ قطرہ ہی رہتا ہے۔اور یہ فضا ایک مجموعی فضا ہے۔کسی حد تک یہ وہ فضا ہے،جس کی ہم پیمائش کرتے ہیں۔اسے ہم رائے عامہ کی سائنس کہتے ہیں،یہ اس وقت نم کی پیمائش ہو رہی ہوتی ہے۔اپنے اس پچاس سالہ تجربے میں اور کچھ اس نم کی پیمائش کی وجہ سے ہمیں یہ اندازہ ہے کہ وہ مرحلہ آن پہنچا ہے کہ جس میں ان تینوں کی تنظیمِ نو کے لیے قطرے کی کمی ہے،نم موجود ہے۔مَیں اس طرح کا حکیم،بزرگ یا مقتدر ہونے کا دعویٰ تو نہیں کر رہا لیکن ہر شخص اس میں اپنا کچھ حصہ تو پیش کر سکتا ہے۔میرا خیال ہے کہ یہ جو سیاسی چھتری یا شطرنج کا تختہ ہے،اس میں ہمیں مرکزی جسے ہم قانون ساز لیجسلیٹو اور صوبائی قانون ساز ادارے ہیں،ان میں سے یہ سادہ اکثریت کا نظام بہ وجوہ آگے نہیں بڑھ رہا اور مجھے کوئی امکان بھی نظر نہیں آ رہا۔اس لیے وہاں ہم متناسب نظام کے ذریعے سے اتفاقی مقنّنہ بنانے کی ضرورت ہے۔اگر مرکزی مقنّنہ بھی اتفاقی اصول کے مطابق ہو کہ جس کا پھر ذریعہ متناسب نمائندگی کا اصول ہو جاتا ہے اور صوبائی مقنّنہ بھی متناسب اصول کی ہو،لہٰذا جو بھی مقنّنہ ہو وہ متناسب نمائندگی کے ذریعے ہو،ایسی مقنّنہ،جس میں متناسب کے ذریعے سے سیاسی جماعتیں،جماعتی لحاظ سے زیادہ مضبوط ہو جاتی ہیں۔چونکہ پھر نامزد کرنے کا اختیار سیاست کے مقامی دھڑوں سے،سیاست کی مرکزی جماعت کو منتقل ہو جاتا ہے۔اس میں مقام کے دھڑوں کی سیاست جو کہ بہت گہری ہوتی ہے کیونکہ دھڑا بھی نیم اکثریتی بننے کے لیے کچھ گروہوں کو جمع کرتا ہے

اور وہ پھر دھڑے کے بجائے سیاسی جماعت اپنے ساتھ لکھتا ہے۔ مقنّنہ کی سیاست کو ہم سیاسی جماعتوں میں رکھیں اور متناسب نمائندگی کے ذریعے سے ،اس میں اتفاق پیدا کریں چونکہ دو چھتریوں والا نظام اب چلنے کا نہیں ہے۔اور نہ دو چھتریوں کے اوپر چھاتے اور چھتریوں کا تعلق ماضی کی طرح لوٹ نہیں سکتا۔ تیسری سطح پر انتظامی اختیارات ایک دن میں نہیں بلکہ رفتہ رفتہ ہم مقنّنہ سے منتظم اداروں کی طرف منتقل کرلیں۔اور جیسے مقنّنہ سے اُبھرا ہو انتظام سیاسی اور انتظامی چھتریوں کے مجموعے چھاتے کا نام ہے اُسی طرح سے نیچے کے جو انتظامی ادارے ہیں ،اس میں بھی تمام پہلوؤں کو پیش نظر رکھا جائے۔اُن کی اصل حقیقت مقنّنہ کی نہیں ہے ،اُن کی اصل حیثیت انتظامی اداروں کی ہے۔اور ہم انتظامی اداروں میں اتفاقِ رائے اس طرح پیدا کرسکتے ہیں کہ وہ ہم سیاسی جماعتوں کی بنیادوں پر نہ کروائیں اور ہر انتخاب میں ایک سے زیادہ سیٹیں رکھیں ،جس کو سیاست کی اصلاح میں ملٹی ممبر کنسیٹیوئنسی کہا جاتا ہے ،کیونکہ ہر ایک مقام پر ایک سے زیادہ برادریاں یا قبائل ہوتے ہیں۔وہ بھی جب ایسے مواقع آتے ہیں تو ان کے اندر سے بھی قبائل کے اپنے چھوٹے حصے جمع ہو جاتے ہیں اور برادریوں کی اپنی چھوٹی برادریاں جمع ہو جاتی ہیں۔ لیکن وہاں بھی قدیم زمانے سے ،خاص طور پر زراعتی علاقوں میں ،اُن کا نظم و نسق اسی طرح سے چلتا ہے کہ وہ برادریوں کی قوت کا ایک توازن ہوتا ہے ،قبائلی گروہوں کی قوت کا ایک توازن ہوتا ہے ،زراعتی علاقوں میں اس کی ضرورت زیادہ پیش آتی ہے۔ قبائلی علاقوں میں بعض اوقات ایک قبائل کے غلبہ کے بعد دوسرا قبیلہ اپنے ذیلی قبیلوں سمیت وہاں سے رخصت ہو جاتا ہے اور یہ ذیلی قبائل کو اس طریقے سے جمع کرتے ہیں کہ ایک قبیلہ بھی کبھی چل جاتا ہے۔بنیادی طور پر برادریوں اور قبائلی نظام کے رد کرنے میں جو شہری خاص طور پر بڑے شہری اور بڑے شہروں میں بھی ولائیتی مزاج آجاتا ہے تو ہم برادریوں اور قبائل کی اصطلاح سننے کے لیے بھی آمادہ نہیں ہوتے حالانکہ وہ سماج کی بہت بڑی حقیقت ہے۔اور سماج کی سب حقیقتوں کی تہذیب ہونی چاہیے ،اُنھیں تحلیل نہیں کردینا چاہیے۔ تو یہ جو تیسری سطح ہے ،یہ چھوٹے موٹے قانون تو بناسکتی ہے لیکن یہ مقنّنہ نہیں ہے ،بلکہ انتظامی ہے۔اس انتظامی ان وجوہات کی وجہ سے ،جو یہاں بیان کی گئی ہیں ،کی وجہ سے ان انتظام میں اب ان سیاسی جماعتوں کی کشمکش کی بجائے یہ کوئی گنجائش چھوڑیں کہ برادریوں اور قبائل کی کشمکش ،اس بھی ایک اتفاق رائے پیدا کرنے کا راستہ ہو۔ میرے بچپن انیس سو ستاون اور اٹھاون میں مقامی حکومتوں کے

انتخابات ہوئے تھے ،انتخابات کی جو پہلی یادداشت میرے ذہن میں ہے وہ یہی ملٹی ممبر کی ہے۔ جس بستی میں ،مَیں تھا، وہاں کچھ چودھری اور کچھ کشمیری تھے۔ چودھری زراعت کی وجہ سے اور کشمیری تجارتی قافلوں کی وجہ سے تھے ، یہ پہاڑی تھے۔ لٰہذا ایک کشمیریوں میں سے امیدوار منتخب ہو گیا اور ایک چودھریوں میں سے منتخب ہو گیا، تو یہ ایک نظام تھا۔ ماضی قریب تک تیسری سطح تک ،جب ہم حکومت بنانے پر آمادہ نہیں تھے تو وہ پرانا نظام ہی چلاآ رہا تھا۔ ملٹی ممبر نہیں تھا۔ یہ بھی کوئی ایسی چیز نہیں ہے جو ہماری یادداشت میں نہ ہو، مَیں تو پرانی نسل سے ہوں تو یہ نئی نسل کی یادداشت کے زمانے کی بات ہو رہی ہے ، لیکن مَیں اگر اس کو بھول جاوں تو سب سے بڑی بات یہ ہے کہ ہم پچھلے بیس سال سے ان تمام امکانات کے بارے میں رائے عامہ معلوم کرتے ہیں ، مَیں اس رائے عامہ کی بنیاد پر کہہ سکتا ہوں کہ رائے عامہ اس تبدیلی کو قبول کرنے کی خواہش مند ہے۔ کچھ تو یہ جو بحران ٹلنے پر نہیں آتا ،اس کی وجہ یہ ہے کہ رائے عامہ کی اکثریت تبدیلی کی خواہش رکھتی ہے ،اس نوعیت کی تبدیلی کی ، محض سیاسی جماعتوں میں قوت کی تبدیلی کی نہیں ، محض سیاسی جماعتوں اور اداروں کے تعلق کی تبدیلی پر نہیں ، محض سماج کے مختلف پرانے اور نئے کی تبدیلی کی نہیں بلکہ یہ کافی نوعیت کی متوسط کی وسط کی تبدیلیاں جن کا ابھی ذکر ہوا، وہ سب تبدیلی چاہتے ہیں ، وہ اس پرانے توازن سے پرانے وسط سے مطمئن نہیں ہیں۔ اس لیے بحران ٹل نہیں رہا۔ ایسا نہیں یہ کوئی تجاویز نہیں ہیں اور اس کے پیچھے پوشیدہ رائے عامہ جس کا اظہار سوائے ،اس طرح کے سائنسی تجزیئے سے نہیں ہوتا۔ یہ سب نم موجود ہے ،اب کس نے اس میں قطرے کا کردار ادا کرنا ہے ؟ کس نے اُس نم کو موقع دینا ہے ؟ میرے ذہن میں اس وقت یہ سب سے بڑا سوال ہے۔